International Research Journal of Religious Studies, Vol.:4, Issue: 02,July,Sep 2024 PP: 13-29

OPEN ACCESS
IRJRS
ISSN (Online): 2959-1384
ISSN (Print): 2959-2569
www.irjrs.com

رضاء اللہ حیدر احوال وآثار

Raza Ullah Haider (A Biography)

Shakeel Amjad Sadiq
Assistant Professor Departmnet of Urdu, Govt. College Okara.
Email: shakeelamjadsadiq@gmail.com

Abstract

Raza Ullah Haider is one of the prominent poets of Urdu. He was born at 1/4L village of Tehsil & District Okara in 1961. His ancestors migrated to Pakistan from Jalandhar (India). His father was the village Headman. His father died owing to electrocution when Raza was only six years old. He passed matriculation examination from Islamia High School, New Campus Okara. Afterwards, he cleared FSc from Government College Sahiwal and passed B.A exam from Government College Okara. He acquired Masters degree in English from FC College. Later he passed the examination of M.A Urdu and M.A Islamiat from Punjab University as private candidate. He retired as Principal Government Graduate College Okara in November 2021. At present, six poetic volumes are at his credit. Among them , five pertains to Glory and Idealisation namely " Madina yad aata hai , Shakh e Sana per mahkay phool, Zia e Harmain, Takreem and Salsabeel". The remaining one is an Ode bearing title" Zakham Gulab huay ". Zia e Harmain is the recipient of Presidential Award. His compendium of poems" Parcham Buland Rakhna " is currently being finalised. Four Mphil theses have been completed upon his poetry, out of which one is being delivered by the undesigned with the title of" Raza Ullah as a Poet ". He remained indulged in reading throughout his life and loved the books. Secondly, he gave priority to teaching and adored his profession. Raza Ullah Haider is blessed with multiple capabilities. He is a great teacher and human being. Raza Ullah Haider is also a religious scholar. His approach towards religion is quite modern. It is his specialty that he addresses religious issues with rationalism. In short , he deals religion with open frame of mind and heart. He became disciple

of Peer Syed Manzoor Ahmad Shah when he was quite young. He belongs to " Arain " clan of Jalandhar. Several of his poetic verses have a reference of " Gulistan , Chamanistan and Paristan". His poetry is manifestation of allied poetic terminologies in vogue. I can say with authority that he is one of the great human beings of the 21st Century.

KeyWords*: Raza ullah Hadir, grand parents, student, lecturer, poet, principal, retierment.*

موضوع کا تعارف:

رضاء اللہ حیدر کا تعلق خاندانِ آرائیاں سے ہے۔ آپ کے جدِ امجد بھارتی پنجاب کے ضلع جالندھر کے گاؤں ''لوہاراں'' کے رہنے والے تھے۔ آپ کے ددھیال اور ننھیال (دونوں خاندانوں) کا تعلق آرائیں خاندان سے ہی تھا۔ یہ دونوں خاندان آپس میں گہرے رشتہ دار تھے اور ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان خاندانوں کا پیشہ زراعت تھا اور اپنی ہی زمینوں پر کاشتکاری کر کے زندگی کی گاڑی کو دھکیل رہے تھے۔ ان کا یہ گاؤں جالندھر سے تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر نکودر'' کو جانے والی ریلوے لائن کے قریب تھا۔ ایک انٹرویو میں رضاء اللہ حیدر یوں بیان کرتے ہیں:

''قیامِ پاکستان کے بعد یہ چھوٹا سا گاؤں کسی جاگیر دار سکھ کو دے دیا گیا اور اب اس کا نام گوگل ارتھ پر ''لوہار سکھا سنگھ'' آتا ہے۔(۱)

قیامِ پاکستان سے پہلے اس چھوٹے گاؤں میں صرف مسلمان ہی آباد تھے۔ اس گاؤں کے اطراف میں مٹھے پور، حسین پو''ر، پھولی والا گاؤں آباد تھے۔ رضا اللہ حیدر کی دادی ایک قریبی گاؤں ''اُگی'' کی رہنے والی تھیں اور آپ کی نانی وہاں کے اپنے آبائی گاؤں ''رسول پور'' کی رہائشی تھیں۔ ''لوہاراں'' سے ''اُگی'' اور ''رسول پور'' کی آمد و رفت کے لیے پیدل ہی سفر کرنا پڑتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب اوکاڑا میں نہر لوئر باری دوآب اور اس سے منسلکہ راجباؤں کی کھدائی کی گئی تو بہت سا بنجر اور ویران علاقہ کاشت کے قابل قرار پایا۔ اسی اثناء میں انگریز حکومت نے ضلع جالندھر کے کسانوں کو زمینیں الاٹ کرنے کا حکم صادر فرمادیا۔ رضاء اللہ حیدر کے پر دادا جان میاں پیر محمد کو کاشت کاری سے شغف تھا لہٰذا وہ بھی انگریز سرکار کو انٹرویو دینے پہنچ گئے۔ انگریز سرکار انٹرویو میں یہ جانچ پرکھ کرتی کہ آیا اُمیدوار خود کاشت کار ہے؟ کیا اُمیدوار بے آباد زمین کو آباد کر کے کاشت بھی کرے گا؟ ان سوالوں کے بعد اُمیدوار سے بیج، پانی، موسم اور فصل کے متعلق سوال کیے جاتے۔ مزید بر آں اُمیدوار کی ہتھیلیوں پر ہل اور کسّی چلانے کے نشانات دیکھے جاتے۔ یوں رضاء اللہ حیدر کے پر دادا جان ان تمام معیارات پر پورے اُترے۔

بقول رضاء اللہ حیدر:

"یوں ۱۹۱۰ء کو میرے پر دادا جان میاں پیر محمد کو ایک مربعہ (25ایکڑ) زمین اوکاڑا شہر سے متصل گاؤں چک نمبر "L.¼میر اں پور" میں الاٹ کر دی گئی۔ 1910ء کے اسٹام پیپر جو زمین کے لیے الاٹ کیے گئے تھے۔ اُن پر میرے پر دادا جان کے انگوٹھے کے نشان موجود ہیں۔(۲)

رضاء اللہ حیدر کے پر دادا کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام میاں فتح محمد اور دوسرے کا نام میاں نتھو تھا۔ میاں پیر محمد نے الاٹ شدہ یہ زمین اپنے دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی اور خود جالندھر لوٹ گئے اور وہاں خود کاشت کاری شروع کر دی۔ میاں پیر محمد کا انتقال ضلع جالندھر کے گاؤں "لوہاراں" میں ہی ہوا اور آپ وہاں پر ہی دفن ہوئے۔ جب میاں پیر محمد نے اپنی دیہی زمین اپنے دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی تو میاں نتھو1912ء میں اپنے بیوی بچوں اور اپنے بھائی (میاں فتح محمد) کے خاندان سمیت ہجرت کر کے جالندھر سے اوکاڑا میں قیام پذیر ہوئے۔

میاں نتھو اور اس کے خاندان کو ایک نقشے کے تحت گاؤں میں گھر بنانے کے لیے جگہ الاٹ کر دی گئی اور یوں میاں نتھو اور اُس کے خاندان نے گھر اور زمین کی آباد کاری کی بنیاد رکھ دی۔ ان زمینوں کو راجباہ L-4 کا پانی سیر اب کرتا تھا۔ رضاء اللہ حیدر کے دادا جان (میاں نتھو) صوم و صلوٰۃ کے خاصے پابند تھے۔ میاں نتھو نے شرعی لحاظ سے داڑھی رکھی ہوئی تھی، نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جہاں نماز کا وقت ہو جاتا وہیں وضو کر کے نماز ادا کر لیتے۔ میاں نتھو کا گھر چونکہ گاؤں کے درمیان میں تھا اس لیے یہ گھر چوپال کا کام بھی دیتا تھا۔ اسی چوپال میں میاں نتھو، مولوی غلام رسول عالم پوری کا لکھا قصہ یوسف زلیخا (احسن القصص) پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میاں نتھو کی آواز میں ترنم اور سوز تھا اور شاعری سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے۔ رضاء اللہ حیدر کے دادا جان (میاں نتھو) اکثر و بیشتر "لوہاراں" ضلع جالندھر جاتے رہتے تھے۔ آخری بار میاں نتھو1928ء میں لوہاراں گئے اور اوکاڑا واپس آتے ہی بیمار ہو گئے اور چند دنوں کی علالت کے بعد میاں نتھو42سال کی عمر میں عدم سدھار گئے۔ آپ کو گاؤں کے قدیمی قبرستان (نزد حضرت کرمانوالہ) میں دفن کر دیا گیا۔

یوں رضاء اللہ حیدر کے دادا جان کے اچانک وفات پا جانے کے بعد خاندان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میاں نتھو نے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں فاطمہ بی بی، عالم بی بی اور ایک بیٹا غلام حیدر (رضاء اللہ حیدر کے والد) چھوڑے۔ یہ تمام بچے ابھی نابالغ تھے اور غلام حیدر کی عمر ابھی پانچ سال تھی۔ رضاء اللہ حیدر کی دادی جان (بیوہ میاں نتھو) نے اپنے ایک بھائی میاں نور محمد کو مع اہل و عیال بلوالیا اور اپنے ساتھ اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔ یوں آپ کی دادی جان اپنے بھائی کی مدد سے خود کاشت کاری کرواتی رہیں اور اہل خانہ کی پرورش کرتی رہیں۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا۔ غلام حیدر کو گاؤں کے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اس طرح غلام حیدر نے شہر اور گاؤں کے سکول سے سات جماعتیں پڑھیں اور کاشت کاری کی طرف راغب ہو گئے۔ بقول رضاء اللہ حیدر:

"میرے والد (غلام حیدر) نے جوان ہو کر کاشت کاری کا سارا نظام سنبھال لیا۔ ہماری کچھ زمینیں فتح پور قصبہ چک خان محمد میں تھیں۔ میرے والد صاحب غلام حیدر بلند قامت، حوصلہ مند اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ کتب بینی اور شعر و شاعری کا ذوق اُن کو ورثے میں ملا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی گاہے گاہے شعر کہتے تھے۔ ۳

رضاء اللہ حیدر کے پر ناناجان کا نام "امام دین" اور پر نانی جان کا نام "رابی" تھا۔ امام دین گاؤں کے تنازعات کے فیصلے کرتے تھے، سرپنچ اور ثالث کے طور پر امام دین کی دانائی اور عدل و انصاف کا چرچا دور دور تک تھا۔ اسی عدل و انصاف اور دانائی کے سبب لوگ امام دین کے خاندان کو (دانے کے) کہنے لگے، یعنی دانائی اور عقل والے۔ امام دین دانے کے تین بیٹے جمال دین، صدر دین اور شرف دین کے علاوہ ایک بیٹی زینب تھی۔ شرف دین کی شادی رسول پور کی رحمت بی بی سے ہوئی۔ 1947ء میں قیامِ پاکستان کے وقت آپ کے ناناجان میاں شرف الدین اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ہجرت کے آزار سہتے ہوئے "لوہاراں" سے اوکاڑا آ گئے۔ میاں شرف الدین کے تین بیٹے محمد رفیق، عبدالمجید، عبدالحمید اور دو بیٹیاں رشیدہ بی بی (والدہ رضاء اللہ حیدر) اور مجیدہ بیگم تھیں۔ ہجرت کی داستان بڑی دردناک، الم ناک اور کرب ناک تھی۔ آپ کا خاندان ہجرت کے صدمات سہتے سہتے "لوہاراں سے "نکودر کے قریب ایک کیمپ میں آ گئے۔ مشہور صحافی حمید اختر مرحوم اپنے کالموں میں اکثر اس کیمپ اور اس میں گزرنے والی زندگی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کئی مہینوں بعد یہاں سے یہ قافلے چلے۔ اکثر قافلے سکھوں نے لوٹ لیے اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ رضاء اللہ حیدر کے ناناجان کا یہ خاندان دو بیل گاڑیوں پر روانہ ہوا تھا۔ امرتسر سے پہلے اس خاندان نے ایک جگہ قیام کیا تو دریائے بیاس میں شدید سیلاب آ گیا۔ بیل گاڑیوں کو روک کر پہیوں کے ارد گرد مٹی باندھ دی۔ پانی بڑھتے بڑھتے کئی فٹ بلند ہو گیا اور یہ سب لوگ بیل گاڑی کے سامان کے اوپر بیٹھے رہے۔

بقول رضاء اللہ حیدر:

"تین دن اور تین رات یہ پانی چلتا رہا۔ اسی دوران بہت سے لوگ مر کھپ گئے۔ درختوں اور کھمبوں پر چڑھے لوگ پانی میں گر کر مرتے رہے۔ بہت سی بیل گاڑیاں (گڈے) پانی میں بہہ گئے۔ میری نانی جان "رحمت بی بی" بتاتی تھیں کہ ایک رات اُنہیں گود میں کوئی نرم سی چیز محسوس ہوئی۔ دیکھا تو ایک سانپ تھا جسے فوراً پکڑ کر پانی میں پھینک دیا گیا۔ ۴

تین دن کے بعد پانی اُترنا شروع ہوا اور حالات مناسب ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن ہیضے کی ایسی وبا پھوٹی جس کی وجہ سے کئی عزیز و اقارب لقمہ اجل بن گئے۔ یہ مختصر سا قافلہ چلا اور آگے امرتسر سے گزرنے کا مرحلہ درپیش تھا کیونکہ امرتسر سکھوں کا گڑھ تھا۔ بقول رضاء اللہ حیدر یہاں ایک قابلِ ذکر واقعہ پیش آیا:

"اس قافلے کے ایک فرد کو پیسوں کی ایک تھیلی مل گئی جو غالباً سیلاب میں بہہ جانے والے کسی خاندان کے بکھرے لاوارث سامان میں پڑی تھی۔ جب یہ صاحب تھیلی لے کر آئے تو سب افراد خوش تھے کہ چلو ان دگرگوں

حالات میں کام آئے گی۔ لیکن میرے نانا جان فرمانے لگے کہ ہم پاکستان جا رہے ہیں جو پاک لوگوں کی سرزمین ہے اور پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگا کر پاکستان بنایا ہے، اس لیے یہ پیسے ہمارے نہیں بیت المال کے ہیں۔ لہٰذا جہاں سے اُٹھائے ہیں وہیں رکھ کر آؤ ورنہ میں بیل گاڑی نہ چلنے دوں گا۔ ایسا ہی ہوا تھیلی وہیں ڈال دی گئی اور قافلہ آگے بڑھا۔"۵

یہاں سے قافلہ آگے بڑھا تو اس قافلے کی حفاظت کے لیے مسلمان فوج کا ایک دستہ وہاں پر پہنچ گیا۔ وہ دستہ ٹینک اور توپوں سے لیس تھا۔ پورے امر تسر میں کرفیو لگا دیا گیا اور اس سارے قافلے کو بحفاظت واہگہ بارڈر سے گزار کر اوکاڑا پہنچا دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اوکاڑا پہنچ کر غلام حیدر اور رشیدہ بی بی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ رضاء اللہ حیدر کی دو بہنیں شمشاد اختر اور خالدہ پروین ہیں۔ دو بھائی ثناء اللہ حیدر اور عطاء اللہ حیدر جڑواں تھے اور اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ رضاء اللہ حیدر بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ رضاء اللہ حیدر کے والد ماجد غلام حیدر نے بھرپور زندگی گزاری۔ آپ شروع ہی سے شریف النفس، نرم خو انصاف پسند اور انسانیت سے محبت کرنے والے تھے۔ آپ نے بلدیاتی الیکشن جیتا اور گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے ڈھیروں کام کیے۔ گاؤں دو دھڑوں میں تقسیم تھا۔ ایک دھڑا امیروں کا تھا اور دوسرا غریب اور متوسط طبقے کا تھا۔ غلام حیدر غریب، مسکین، مفلوک الحال دھڑے کی سربراہی کرتے تھے۔ جب کوئی وڈیرا کسی غریب پر ظلم کرتا، اس کی عزتِ نفس مجروح کرتا، اس سے دستِ و گریباں ہوتا یا اسے ناحق گرفتار کروا دیتا تو غلام حیدر اس گروپ کے آگے سینہ سپر ہو جاتے اور غریب اور مظلوم کی حمایت و اعانت کرتے۔ غلام حیدر کو قرآن مجید سے حد درجہ شغف تھا۔ آپ لفظی اور بامحاورہ ترجمے کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ آپ کی قرآن پاک سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ نے نیا گھر تعمیر کروایا تو کئی مقامات پر قرآنی آیات کندہ کروائیں۔ گاؤں میں اس وقت بجلی کی ترسیل کا نظام نہ تھا۔ ہر بار آپ کی کوشش کے باوجود مخالف دھڑا آڑے آجاتا اور آپ کی کوشش کی راہوں میں روڑے اٹکاتا۔ بالآخر آپ کی دن رات کی محنتِ شاقہ سے گاؤں میں بجلی در آئی۔ جب گاؤں میں بجلی آگئی تو خبریں سننے کے لیے آپ ایک ریڈیو خرید لائے۔ آپ یہ ریڈیو گھر کے باہر چوک میں لگا دیتے اور لوگ ممبر صاحب کا ریڈیو سننے کے لیے جوق در جوق چلے آتے۔ اس چوپال میں آپ لوگوں کا حال احوال پوچھتے اور دُکھی لوگوں کا مداوا بھی کرتے۔ آپ کی ان خوبیوں کی بناء پر لوگ آپ سے بے پناہ محبت کرتے اور آپ کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ یہ ریڈیو انٹینا کی مدد سے چلتا تھا۔ ایک دن گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور خرابیٔ موسم کی بناء پر گرج چمک کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ آپ گھر میں ریڈیو کا انٹینا لگا رہے تھے کہ تار میں کسی طرح کرنٹ آگیا اور وہ تار اُن کے اوپر گر گیا۔ اس حادثے میں وہ 37 سال کی عمر میں حیات کی سرحد پار کر گئے۔ غلام حیدر کی وفات کے وقت رضاء اللہ حیدر کی عمر پانچ ماہ تھی۔ رضاء اللہ حیدر اپنی سوانح عمری "اوراق انسیت" (غیر مطبوعہ) میں یوں رقمطراز ہیں:

اس سانحے کے بعد والدہ رشیدہ بی بی نے ہماری پرورش کی۔ نانا جان شرف دین، خالہ، ماموں معاونت کے لیے موجود تھے۔ دادی جاں اپنی شفقتیں لٹاتی ہوئیں 1969ء میں انتقال کر گئیں۔ زمینیں ٹھیکے پر دے دی گئیں اور یوں وقت کا دریا بہتا رہا۔ والدہ محترمہ کو اللہ نے لمبی عمر دی، ہم بہنوں بھائیوں کو شاد و آباد کر کے 2008ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ نانا جان 1975ء اور نانی جان 1984ء میں فوت ہوئے۔٦

شروع کے دور میں بچوں کی تاریخ پیدائش کے اندراج کا باقاعدہ کوئی نظام نہ تھا کیونکہ والدین اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے کہ اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش الگ سے کسی ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ بعض اوقات تو اندازہ لگا کر بچے کی عمر بتائی جاتی تھی کہ یہ فلاں سال فلاں موسم میں پیدا ہوا تھا۔ والدین جب بچے کو سکول میں داخل کروانے جاتے تو اساتذہ کرام اندازے سے تاریخ پیدائش لکھ دیتے۔ اسی طرح جب میٹرک کا داخلہ جاتا تو نام اور تاریخ پر نظر ثانی کر لی جاتی۔ میٹرک تک آپ کے نام کے ساتھ حیدر کا اضافہ نہ تھا مگر ایک استادِ محترم نے رضا اللہ کو رضاء اللہ حیدر لکھ دیا اور پھر اسی نام سے آپ کا میٹرک کا داخلہ بھیج دیا۔ یوں آپ رضا اللہ سے رضاء اللہ حیدر ہو گئے اور آج تک آپ اسی نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

کسی بھی موقع پر جب آپ کو "رضاء اللہ حیدر" کہہ کر پکارا جاتا ہے تو آپ کا پورا تشخص اور امیج بادِ بہاری کی طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ آپ 12 نومبر 1961ء کو چک نمبر L1.4. میراں پور ضلع اوکاڑا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی پرائمری تک تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے ہی حاصل کی۔ آپ اس دور کی یادوں کو یوں دہراتے ہیں: "اس دور کی ایک ایک بات مجھے یاد ہے۔ اکثر اساتذہ کرام مارپٹائی کے ماہر تھے اور ڈنڈے کے بغیر استاد کا تصور ادھورا ہوتا تھا، اس دور کی ایک تلخ یاد یہ ہے کہ اکثر اساتذہ اتنے سادہ لوح ہوتے تھے کہ وہ بچوں سے کھانے پینے اور عام استعمال کی چیزیں منگواتے تھے۔ کوئی لسی منگوا رہا ہے تو کوئی چائے، کسی نے آلو اکٹھے کرنے کو تدریس کا اعلیٰ اصول سمجھا ہے تو کوئی بہانے بہانے سے پیسے بٹور رہا ہے۔٧

جب آپ پانچویں کلاس میں ہوئے تو ایک استاد صوفی نذیر احمد آئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ کوئی طالب علم کسی استاد کے لیے خورونوش کی کوئی چیز نہیں لائے گا۔ صوفی نذیر احمد کی یہ بات آپ کے لیے صحرا میں بارش کی آمد کے مترادف تھی۔ ورنہ اُن حالات میں صوفی نذیر احمد کی یہ بات کہنا دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے کے مترادف تھی۔ آپ کے ایک استاد محمد نواز تفریح کے بعد اخبار سے املاء لکھواتے تھے۔ سکول میں "امروز" اخبار آتا تھا اور یہی اخبار آپ کے ماموں کی دکان پر بھی آتا تھا۔ تفریح کے وقت آپ ماموں کی دُکان پر آتے اور اس اخبار کی چیدہ چیدہ سرخیاں دیکھ جاتے۔ اُن میں اکثر سرخیاں املاء میں بھی لکھوا دی جاتیں اور یوں آپ کے املاء میں خاطر خواہ بہتری آئی اور اخبار بینی کا شوق بھی آپ کی طبیعت میں سرایت کر گیا اور کلاس چہارم سے آپ کی اخبار بینی کی ایسی عادت بنی کہ بس فطرتِ ثانیہ ہو گئی۔ آپ کے سکول میں یوم والدین کی تقریب تھی تو آپ کے استاد نے ایک ملی نغمہ یاد کرنے کو کہا کیونکہ آپ کلاس میں اول دوم

آتے تھے اور آپ کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ آپ لفظ ملی بھول گئے اور نغمے کو یاد رکھا۔ آپ نے بڑی محنت سے عنایت حسین بھٹی کا ایک فلمی گیت یاد کیا۔ آپ اُٹھتے بیٹھتے گلیوں میں چلتے پھرتے اس گیت کی ریہرسل کرتے رہے۔ استاد محترم نے رہنمائی یا سماعت کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ جلسہ شروع ہو گیا اور آپ کے نانا جان بھی اس جلسے میں تشریف فرما تھے۔ جب ملی نغمے کے لیے آپ کو بلا گیا تو آپ نے بڑے ترنم اور سوز سے "ملی نغمے" کا آغاز یوں کیا بقول آپ کے:

صدقے میں جاواں اوہناں توں جنھاں دیاں بانکیاں ٹوراں

ساڈے نال غصے رہندے تے درشن دیندے ہوراں

"میں نے غور کیا کہ سارا پنڈال ہنس رہا ہے۔ کچی گری جیا رنگ ہووے تے اکھ بدامی تک پہنچا تھا کہ ایک استاد نے مائیک سے ہٹا دیا۔ میں خاموشی سے نیچے اُتر آیا اور پوری تقریب میں افسردہ رہا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔ گھر آ کر نانا جان نے مجھے ملی نغمے کا مطلب سمجھایا۔ یوں میری پریشانی رفع ہوئی۔"۸

گاؤں کے سکول سے پرائمری پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ ہائی سکول نیو کیمپس اوکاڑا میں چھٹی کلاس میں داخل ہو گئے۔ اس سکول میں آم اور جامن کے اتنے درخت تھے کہ یہ سکول باغ معلوم ہوتا تھا۔ آپ فطرتی مناظر کے دل دادہ تھے۔ لہٰذا آپ کا دل سکول میں فوراً لگ گیا۔ اس دور میں سکولوں کی "نیشنلائزیشن" نہیں ہوئی تھی اور اس سکول کے مالک شیخ عبدالحق تھے اور وہ باقاعدہ سکول آتے تھے۔ ابھی آپ چھٹی کلاس میں ہی تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے سکول کو اپنی تحویل میں لے لیا اور جمیل اختر جاوید اس سکول کے نئے ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے۔ جمیل اختر جاوید ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ جمیل اختر جاوید سکول میں اکثر تقاریب کا انعقاد کرواتے رہتے تھے۔ ایک تقریب میں انھوں نے صوبائی وزیر خزانہ حنیف رامے کو بلایا اور عبدالحفیظ کاردار اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔ آپ کو یہ شخصیات بہت پسند آئیں اور ان شخصیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کلاس میں تیسرے نمبر پر تھے لیکن ایک استادِ محترم اپنے نکھٹو صاحبزادے کو کھینچ تان کر تیسرے نمبر پر لے آئے اور یوں آپ کی پوزیشن غارت کر دی جاتی۔ آپ نے دبے دبے الفاظ میں اس عمل پر احتجاج کیا اور بات اس استاد تک پہنچ گئی اور یوں اس استاد نے آٹھویں کلاس میں تیسری پوزیشن پر اپنے صاحبزادے کے ساتھ آپ کو بھی شامل کر لیا۔ پہلی اور دوسری پوزیشن پر بالترتیب میرے ہم جماعت آفتاب احمد اور صفدر علی آئے۔ یہ اعلیٰ درجے کے ذہین تھے ان کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان دونوں نے بعد میں ملتان بورڈ 1979ء میں ایف ایس سی میں پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ کا کلاس نہم میں پہلا دن تھا کہ آپ کے سائنس ٹیچر محمد انور نے کیمسٹری کی کتاب کے دیباچے کی قرأت کرائی تو اتفاقاً پہلے بینچ پر بیٹھے آٹھویں جماعت میں اول دوم سوم آنے والے قابو آ گئے۔ لفظ منظم کا تلفظ درست نہ تھا تو انور صاحب نے کہا چلو نکلو کلاس سے "جانویں جیہے کتھوں آ گئے سائنس پڑھن"۔ یہ سائنس کیوں رکھی یہ تو بہت مشکل ہے، ہم آئندہ آرٹس پڑھنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اتنے میں ایک طرف سے ہمارے مڈل کے استاد راؤ مہدی حسن خاں تشریف لے آئے۔ ہمیں باہر کھڑے دیکھ کر حالات معلوم کیے اور خوب ہنسے

اور ہمیں کلاس میں لے گئے اور انور صاحب سے یوں گویا ہوئے کہ آپ نے پڑھنے لکھنے والے باہر نکال دیے ہیں اور چھان بور الے کر کلاس میں بیٹھے ہو اور یوں ہم لوگ کلاس میں بیٹھ گئے۔ بقول آپ کے:

"بعد میں انور صاحب سے ہمارے تعلقات بہت خوش گوار رہے۔ میٹرک میں آفتاب اور صفدر تو بورڈ کے ٹاپرز میں تھے اور میں نے بھی سکالرشپ حاصل کیا۔"۹

میٹرک کرنے کے بعد آپ نے 1977ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ایف ایس سی میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔ ساہیوال کالج کے دو سال بڑے رومانوی تھے۔ آپ نے چک نمبر 90 / R6- میں اپنی پھوپھی جان عالم بی بی اور بڑی بہن شمشاد اختر کے ہاں قیام کیا۔ آپ اپنی بائیسکل پر گنگناتے اور لہراتے ہوئے کالج آتے اور واپسی پر فرید ٹاؤن سے گزر کر اپنے گاؤں جاتے۔ اُن دنوں ڈاکٹر وزیر آغا کے بہنوئی امجد علی آغا پرنسپل تھے۔ اُن دنوں کالج میں سیاست اور الیکشن کا بازار گرم رہتا تھا۔ خادم حسین طاہر، ذکی چوہدری اور قسور مبارک بٹ سیاست کے روح رواں تھے۔ ان تمام حالات کے باوجود کالج کی تعلیمی فضا بہت عمدہ تھی اور تمام اساتذہ کرام بڑی محنت اور لگن سے طالب علموں کی تعلیمی مساعی اور کردار سازی میں مگن تھے۔ پورے کالج میں ڈاکٹر اے ڈی نسیم اور سید مسعود حیدر بخاری جیسے ناموں کا ڈنکا بجتا تھا۔ پروفیسر خلیل الرحمن آپ کے اُردو کے استاد تھے اور ان کا شمار آپ کے پسندیدہ اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے اُنھیں خفیہ خط لکھ دیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا:

"آپ بظاہر بڑے ماڈرن اور سوٹڈ بوٹڈ ہیں لیکن اندر سے صوفی اور حکیم ہیں کہ نہایت عمدہ، نفیس گفتگو فرماتے ہیں، کئی دن بعد کلاس میں آئے تو قدرت اللہ شہاب کے والد عبداللہ اور ماں جی کا قصہ سنایا کہ انھوں نے انگریز گورنر جنرل کی دعوت کی۔ گورنر نے لذیز کھانا کھا کر کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ خان ساماں کے ہاتھ چوم لوں۔ کھانا تو ماں جی نے بنایا تھا۔ عبداللہ نے یہ بات ماں جی کو بتائی تو ظاہر ہے وہ غیرت میں آگئیں کہ آئے تو سہی کوئی میرے ہاتھ چومنے۔ آخر میں اچانک سر خلیل بولے کہ میرا دل چاہتا ہے اُس طالب علم کے ہاتھ چوم لوں جس نے مجھے خط لکھا ہے اور۔۔۔۔۔ میں کلاس میں سر جھکائے شرمندہ سا دبکا بیٹھا رہا۔"۱۰

ایف ایس سی کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج اوکاڑا میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اُن دنوں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی صدر شعبہ اُردو تھے لیکن آپ نے اردو بطور مضمون نہیں رکھا تھا۔ لہٰذا آپ اُن سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے۔ (مگر بعد میں آپ نے بطور کولیگ اُن سے بہت کچھ سیکھا اور اُن کی وفات تک اُن سے نیاز مندی کا سلسلہ جاری رہا۔) طالب علم مدیر کا انتخاب ہونا تھا تو پروفیسر منشاء صاحب نے نوٹس لگا دیا تو پچیس طالب علم آگئے۔ منشاء صاحب نے طالب علموں کو لائن میں بٹھا لیا اور "فی البدیہ" موضوع دیا کہ اس پر انگریزی میں مضمون لکھو۔ اس امتحان میں آپ اور آپ کے دوست شجاع قطب بھٹی منتخب ہوئے۔ شجاع قطب بھٹی ایم اے انگلش کرنے کے بعد پی سی ایس میں چلے گئے اور آپ نے بھی ایم اے انگریزی ایف سی کالج سے کیا۔ جب آپ نے ایف سی کالج میں داخلہ تحریری ٹیسٹ پاس کیا تو انٹرویو کا مرحلہ بڑا دلچسپ

تھا۔ پروفیسر جیلانی کامران صاحب نے سوال پوچھا کہ آپ اوکاڑا سے آئے ہیں۔ یہ اوکاڑا، ساہیوال، پاکپتن ملکہ ہانس کے علاقے کے لوگوں کا مزاج بڑا شاعرانہ ہوتا ہے۔ کیا اس علاقے کا پنجابی شاعری سے بھی کوئی سروکار ہے؟ آپ نے چونکہ ہیر وارث شاہ اور اس کے متعلق کچھ مضامین پڑھ رکھے تھے۔ آپ نے فوراً بتایا کہ وارث شاہ نے ہیر "ملکہ ہانس" میں لکھی تھی۔ یہ سن کر جیلانی کامران بہت خوش ہوئے اور یہی وہ پوچھنا چاہتے تھے۔ آپ اور جیلانی کامران کے درمیان وارث شاہ کی شاعری حقیقت اور مجاز پر خاصی دلچسپ گفتگو ہوئی اور میرٹ پر آپ کا داخلہ ایف سی کالج میں ہو گیا۔

ایف سی کالج کے اساتذہ جیلانی کامران، اشفاق سرور، آغا ضیاء الرحمن، عبدالرؤف، کمال الدین اور میڈم شمیم نرگس سب کے سب علم و ادب کے سمندر اور مخزن تھے۔ آپ نے دو سال تک اُن سے علمی اور ادبی فیض حاصل کیا۔ آپ نے دو سال تک لاہور کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا بھرپور مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اس دوران میں آپ نے علم و ادب کے خوب موتی چُنے۔ آپ لائبریریوں سے کتابیں لے کر خوب مطالعہ کرتے۔ برٹش کونسل اور امریکن سینٹر بھی جاتے، مجلس اقبال کے سالانہ جلسوں میں شرکت کرتے اور مشاہیر کے خطابات سنتے۔ بادشاہی مسجد میں 1984ء میں قاری عبدالباسط عبدالصمد کی تلاوت قرآن سننے کا موقع ملا۔ اتفاق مسجد میں علامہ طاہر القادری کے خطابات سننے جاتے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بیانات سننے جاتے اور اسی دوران جسٹس پیر کرم شاہ الازہری سے بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ دور (۱۹۸۳۔۸۵) سنہری دور تھا اور اس دور میں آپ نے بہت کچھ سیکھا اور اس کو اپنی عملی زندگی میں لاگو کیا۔ اپنی عملی زندگی کے بارے میں آپ یوں رقمطراز ہیں:

"ایم اے انگلش کرنے کے بعد میں نے بطور پرائیویٹ طالب علم 1986ء میں ایم اے اردو اور 1987ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات بھی کیا۔ 1987ء میں بطور لیکچرار اُردو میرا انتخاب ہوا اور پھر سروس کے دوران میں 2002ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اُردو مکمل کیا۔" (۱۱)

1978ء، بطور لیکچرار اُردو پہلا تقرر گورنمنٹ کالج دیپالپور میں ہوا۔ آپ نے چونکہ ایف سی کالج لاہور سے ایم اے انگلش ریگولر بنیادوں پر کیا ہوا تھا، بعض احباب نے افسوس کے انداز میں کہا کہ آپ کی انگلش میں سلیکشن ہونی چاہیے تھے تو آپ نے کہا اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہتری ہو گی۔ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ:

"میں نے ایف ایس سی کی اردو لازمی کے علاوہ اردو تو پڑھی ہی نہیں تھی اور ایم اے بھی چند گائیڈز پڑھ کر پاس کیا۔ اب پڑھاؤں گا تو اُردو زبان و ادب میں مہارت حاصل کروں گا اور تخیل میں ایک چراغ سا جلا کر شاید میری شوقیہ شاعری بہتر ہو اور کبھی میری شاعری کا بھی مجموعہ شائع ہو، بعد میں یہ باتیں درست ثابت ہوئیں اور میرے حمد و نعت کے مجموعے "ضیائے حرمین" کو صدارتی ایوارڈ تک مل گیا۔ ۱۲

گورنمنٹ کالج دیپالپور میں آپ کو اپنے ایم۔ اے انگلش کے کلاس فیلو خالد محمود بھی شعبہ انگریزی میں مل گئے۔ خالد محمود کا بنیادی تعلق لاہور سے تھا لیکن سروس کے سلسلے میں دیپالپور میں ہی رہائش پذیر تھے۔ دیپالپور میں آپ کو علمی

و ادبی شخصیات کی رفاقت میسر آئی۔ پروفیسر منظور حسین بصیرپوری (حافظ بصیر پوری) اعلیٰ دینی، روحانی اور علمی ادبی شخصیت تھے۔ حافظ صاحب بہت سلجھی ہوئی اور معتدل گفتگو فرماتے تھے۔ اُن کے شعری مجموعے اور سفر نامہ حج ''اُس دیار میں'' خاصے کی چیز ہیں۔ 1984ء میں ابوالخیر نور اللہ نعیمی کا انتقال ہوا تو آپ اپنے گاؤں کے امام مسجد کے ساتھ جنازہ پڑھنے بصیر پور آئے تھے۔ بقول آپ کے:

''حافظ صاحب سے جنازہ کے بعد ملاقات ہوئی تو میرے ہمراہی امام مسجد پوچھنے لگے، 'حافظ صاحب! ہور سب خیر اے' حافظ صاحب نے جواب دیا، 'ابوالخیر تو چلے گئے، خیر کیا ہونی ہے!' میں اس جواب سے بہت محظوظ ہوا تھا۔''

۱۳

پروفیسر امجد علی شاکر آپ کے صدر شعبہ اُردو تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی علمی، ادبی کتاب ہمہ وقت اپنے ہاتھ میں رکھے ہوتے تھے۔ وہ اکثر اوکاڑا آتے اور ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اور اقبال صلاح الدین سے فیض پاتے۔ امجد علی شاکر نے سی ایس ایس کے اُردو نصاب کے حوالے سے ایک عمدہ کتاب بھی لکھی تھی۔ امجد علی شاکر نے اردو میں ایم فل کر رکھا تھا اور وہ بہت جلد گریڈ 19 میں چلے گئے۔ آپ نے تقاریب میں دوستوں کے مزاحیہ خاکے اور نظمیں پڑھنا شروع کیں۔ اکثر دوست تو اس سے محظوظ ہوتے لیکن کچھ دوست جو حساس طبیعت کے تھے ناراض بھی ہو جاتے۔ آپ نے امجد علی شاکر کے لیے غالب کی ایک معروف غزل کی پیروڈی کی۔ امجد علی شاکر سن کر بہت خوش ہوئے اور تحسین فرمائی۔

اس کے دو اشعار کچھ یوں ہیں:

تیرے لہجے کی گلاوٹ، تیرے جسم کی بناوٹ
کوئی ساہوکار ہوتا، کوئی تھانیدار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان شاکرؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ لیکچرار ہوتا

۱۴

آپ نے غالب اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے تعلق سے کتابوں میں پڑھا تھا۔ ایم فل کے تھیسس کے حوالے سے یہ موضوع ذہن میں تھا۔ پروفیسر امجد علی شاکر کے مشورے سے موضوع کو وسعت دی اور ''غالب اور معاصر علماء'' کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ شاکر صاحب نے کچھ ضروری کتب بھی عطا کیں۔ شاکر صاحب کے کچھ نظریات ہم عام پاکستانیوں کے نظریات سے مختلف بھی ہیں۔ وہ مولانا عبید اللہ سندھی، ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور متحدہ قومیت کے حامی علماء کے فکری طور پر قریب ہیں۔ مروج مسلمہ دینی تعلیمات اور حضرت قائد اعظم اور حضرت علامہ اقبال کے حوالے سے بعض اوقات اُن کی تنقیدی جارحانہ گفتگو آپ کو حیران و پریشان کر دیتی ہے۔ دیپالپور کالج میں پروفیسر محمد صدیق قمر بھی عالم و فاضل شخصیت تھے۔ اُن کی مذہبی فکر میں توازن اور اعتدال تھا اور وسعت مطالعہ کی بناء پر مثبت بات

کو تسلیم کرتے تھے اور اختلاف کرتے ہوئے بھی بڑے علماء کا احترام ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ وہاں شعبہ اسلامیات کے ایک استاد خود کو اموی اور یزیدی کہلوانے پر فخر کرتے تھے اور یہی موضوع اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ قمرؔ صاحب نے رہنمائی فرمائی کہ یہ ناصبیت ہے اور بعض مذہبی فرقے اُس کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ سید انوار الحسن بخاری معتدل مزاج شیعہ تھے اور کبھی کبھی ناصبیت سے ٹکرا جاتے تھے۔

آپ نے اپنی ایک ڈائری میں سو نعتیں جمع کیں اور بطور اصلاح ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کو اُن کے گھر دے آئے۔ انھوں نے کچھ کاٹ دیں، کچھ کی تحسین کی اور کچھ کی اصلاح فرما دی اور بحور و اوزان کے حوالے سے کچھ ہدایات صادر فرما دیں۔ آپ نے انھی ہدایات کی روشنی میں اپنا پہلا مجموعہ نعت "مدینہ یاد آتا ہے" ترتیب دیا اُس پر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے تحسینی کلمات بھی لکھے ہوئے ہیں یہ آپ کا پہلا مجموعہ نعت تھا جو 2004ء میں شائع ہوا۔ ایم فل میں داخلے کے لیے آپ نے تین مقالے تحریر کیے، مجید امجد ایک بڑا نظم گو، دیوانِ غالب کا پہلا شعر اور اقبال کے معاشی نظریات۔ ان مقالات کی بنیاد پر آپ کا داخلہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم فل میں ہو گیا۔ ورکشاپ میں آپ کو ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر محمد صدیق شبلی اور ڈاکٹر نثار احمد قریشی سے بھرپور استفادے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور آپ کے اس مقالے کے نگران ٹھہرے۔ بقول آپ کے:

"میرا مقالہ جلد بندی کے بعد ڈاکٹر معین الرحمن کے کالج آفس کی میز پر پڑا تھا۔ اتنے میں پروفیسر صابر لودھی تشریف لائے اور ایک کاپی اٹھا کر تعریف کرنے لگے۔ واہ کیا موضوع ہے، کیا نادر تحقیق ہو گی۔ میں کھڑا ہو گیا اور بڑے احترام سے ملا۔ انھوں نے گلے لگا کر مبارک باد دی۔ میں نے لودھی صاحب کو بتایا کہ کمیشن میں میرا انٹرویو انھوں نے لیا تھا۔ وہ چونک کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ بتاؤ، کیا اُس میں تم منتخب ہو گئے تھے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے دوبارہ گلے لگا کر کہا، شکر ہے، ورنہ آج میں یہاں کتنا شرمندہ ہوتا۔ ڈاکٹر معین الرحمن اس سے خوب محظوظ ہوئے۔ ۱۵

مئی 1991ء میں آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور جون 1991ء میں آپ گورنمنٹ کالج دیپالپور سے ٹرانسفر ہو کر گورنمنٹ ڈگری کالج اوکاڑا تعینات ہو گئے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی 1990ء میں ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور شعبہ اُردو میں نور محمد اختر، غلام رسول چودھری، ندیم اشرف شیخ، محمد حسین چودھری اور رانا غلام محی الدین کی علمی و ادبی صحبتیں میسر آئیں۔ شعبہ جغرافیہ کے پروفیسر منظور حسین عباسی سے بھی آپ نے علمی فیض پایا۔ آپ کے بقول:

16"مئی 1991ء میں ساہیوال میں میری شادی ہوئی۔ میری اہلیہ کا نام ثمینہ کوثر ہے۔ اس کی تعلیم ایم اے اسلامیات ہے اور گھریلو خاتون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی حمنہ عدین (بی۔ایس سی) تاریخ پیدائش 23نومبر 1992ء اور دو بیٹوں سے نوازا۔ بڑے بیٹے کا نام محمد حمزہ ہے جو کہ الیکٹریکل انجینئر ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش 6جولائی 1994ء ہے جبکہ چھوٹے بیٹے کا نام محمد حنظلہ ہے جو کہ بی ایس آئی ٹی کا طالب علم ہے۔ اس کی تاریخ

پیدائش 10 جولائی 2001ء ہے۔ بیٹی کی شادی کر دی ہے اور دو نواسے اور ایک نواسی ہے۔ بیٹے غیر شادی شدہ ہیں۔۱۶

ڈاکٹر معین الرحمن کا رویہ آپ کے ساتھ بڑا مشفقانہ تھا۔ وہ اپنی ذاتی لائبریری سے آپ کو کتابیں مہیا کرتے اور آپ کے انکار کے باوجود آپ کو اپنے گھر لے جاتے اور کھانا تک کھلاتے۔ جب آپ کا مقالہ پیش ہوا تو ڈاکٹر عبد العزیز ساحر نے آپ کے مقالے کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا، آپ کو خوبصورت مشوروں سے نوازا اور داد و تحسین بھی فرمائی۔ بقول آپ کے:

''ڈاکٹر معین الرحمن نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ مقالہ پی ایچ ڈی لیول کا ہے۔ یہ کلمات میرے لیے حوصلہ افزاء ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم۔۱۷

آپ کے گورنمنٹ کالج اوکاڑا کے تقرر کے دوران میں پروفیسر خالد رفیع اور پروفیسر محمد ریاض خاں بھی تشریف لے آئے۔ کالج میں علمی و ادبی تقریبات کا بھرپور عروج دیکھنے کو ملا۔ بین الکلیاتی مقابلہ جات میں آپ کے طلباء نے سیکڑوں انعامات جیتے۔ آپ کی لکھی ہوئی دس سے زائد نظمیں بین الکلیاتی مقابلہ جات میں اول قرار پائیں۔ آپ نے طلباء کے لیے بے شمار تقاریر بھی لکھیں جو پنجاب اور پاکستان لیول پر اول قرار پائیں۔ کالج میگزین ''احساس'' کو مرتب کرنے میں آپ نے شبانہ روز محنت اور معاونت کی۔ اقرار علی راؤ کی پرنسپل شپ میں دو کالج گزٹ ترتیب دے کر شائع کروائے اور بعد میں دو مرتبہ مدیر کی حیثیت سے کالج میگزین ''احساس'' مرتب کر کے شائع کرایا۔ آپ چیف منسٹر ادبی مقابلہ جات کے کئی سال تک انچارج رہے اور علمی و ادبی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ کالج میگزین میں اردو شاعری کے ساتھ ساتھ آپ کی پنجابی اور انگریزی شاعری بھی چھپتی رہی۔ 2012ء میں آپ نے یو۔ ایس۔ ایڈ کے تحت دو عدد تعلیمی کتابوں کے انگریزی سے اردو تراجم کیے اور اس سلسلے میں معقول معاوضے کے حق دار ٹھہرے۔

اسلامی تعلیمات بچپن ہی سے آپ کے قلب و ذہن میں سما گئی تھیں۔ آپ ساتویں کلاس میں چھت پر پتنگ بازی کر رہے تھے تو مولوی صاحب سپیکر میں ''سورۃ الغاشیہ'' کا ترجمہ اور تفسیر بتا رہے تھے تو آپ کی پوری توجہ مولوی کے اس بیان کی طرف ہو گئی۔ آپ جب بھی قرآنی سورتوں کا ترجمہ پڑھتے تو آپ کی پوری توجہ فکر آخرت کی طرف ہو جاتی۔ آپ کو جو بھی دینی کتاب ملتی آپ اُسے ختم کر کے دم لیتے۔ آپ نے امام غزالیؒ اور امام سیوطیؒ کی تمام کتابوں کے تراجم پڑھ ڈالے۔ آپ کو مطالعے کا بھرپور نشہ تھا۔ ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے بعد جو بھی پیسے بچتے آپ اُن کی کتابیں خرید لیتے۔ آپ نے 1980ء میں اپنے گاؤں کی مسجد میں ایک لائبریری قائم کی جو ابھی تک قائم و دائم ہے اور نسل نو اس لائبریری سے بھرپور استفادہ کر رہی ہے۔ آپ نے تصوف کی اُمہات کتب بھی پڑھ ڈالیں۔ آپ نے تفسیر ضیاء القرآن، تفہیم القرآن اور احادیث کی کتب کے تراجم بھی پڑھ ڈالے۔ آپ کو اسلام، سائنس اور خصوصاً علم فلکیات سے گہرا شغف ہے۔ آپ کا ابو النصر منظور احمد شاہ ہاشمیؒ جامعہ فریدیہ ساہیوال سے سلسلہ بیعت وارادت ہمیشہ قائم رہا۔ آپ کو اُن سے محبت ووارفتگی اور درد و سوز کے لازوال خزانے ملے۔ آپ میٹرک کلاس میں تھے جب آپ نے صوم و صلوۃ کی باقاعدہ

پابندی شروع کر دی اور ایف ایس سی میں تھے تو باقاعدہ داڑھی رکھ لی۔ اس دور میں داڑھی رکھنے کا رواج نہ تھا اور ماحول میں ایک ہلچل سی مچ گئی مگر آپ اپنے اس عمل پر تہہ دل سے ثابت قدم رہے۔ آپ نے جوانی میں ہی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پیر کرم شاہ الازہریؒ، ڈاکٹر طاہر القادریؒ اور ڈاکٹر اسرار احمد کی کتب اور بیانات سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ کو شروع سے فرقہ واریت سے خاص الجھن ہوتی تھی۔ آپ نے کسی دور میں مناظرانہ کتابیں پڑھیں لیکن جب آپ نے دیکھا کہ علماء اپنے فرقے کے اکابر کا جھوٹا دفاع کرتے ہیں اور ان کی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتے اور دوسروں کی آنکھ کے تنکے بھی شہتیر بنا کر پیش کرتے ہیں تو آپ نے مناظرانہ کتابیں پڑھنا بند کر دیں۔ آپ کے نزدیک فضول مذہبی رسومات اور بدعات نے اسلام کے چہرے کو داغ دار کیا ہے اور بعض علماء کے متشدد رویوں نے فرقہ واریت کی آگ بھڑکا رکھی ہے اور وہ دوسروں پر شرک و کفر اور گستاخی کے فتوے لگانے میں بڑے بے باک ہیں۔ علماء کے بال کی کھال اتارنے اور فروعات میں موشگافیاں کرنے کے رویے نے نئے عقائد و نظریات پیدا کر دیے ہیں جن کا اسلاف کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ ہمارے اسلاف، محکمات پر عمل پیرا ہو کر دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گئے اور ہم متشابہات پر مناظرے کر کے جہاں بھر میں تماشا بنے ہوئے ہیں۔ آپ کے بقول:

"توحید سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ ہے۔ شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کی معافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ترجیح اول ہے اور اُس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں۔ عبادت و دعا و مناجات کا تعلق صرف اُسی سے ہے۔ نذر اور قربانی صرف اسی کے لیے ہے۔ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے تو ہر مشکل، پریشانی میں اُسی سے دعا و التجا کرنی ہے۔ ۸۱

آپ کے نزدیک ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک فقہ کو ترجیح دینے کے مناظرانہ اطوار کو چھوڑ کر ہمیں جدید دور کے چیلنجوں کا علمی جواب دینا چاہیے۔ اسلاف کی تحقیقات اور آراء سے استفادہ کر کے اجتہادی نقطۂ نظر اپنانے کی ضرورت ہے۔ قادیانیت جیسے کئی انحرافی رجحانات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ لادینیت اور مادر پدر آزادی کی عالمگیر تحریک کا دلائل اور خوش اسلوبی سے توڑ کرنا چاہتے۔ توہمات و تعصبات چھوڑ کر سائنسی اور استدلالی طرزِ فکر اپنانے کی ضرورت ہے۔ فروعی اختلافات دراصل دین کی وسعت ہیں۔ ان مسائل پر سوشل میڈیا پر مناظرے دیکھ کر دل جلتا ہے۔ ہم نے تو قرآن کے شفابخش پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہچانا ہے اور افسوس ہم اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے باہم دست و گریباں رہتے ہیں۔ سیرت النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اور سیرت صحابہ و اہل بیتِ کرام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ایمان و اسلام کا موتی ہمارے دامن کی زینت بنانے کے لیے کیسی کیسی دل خراش مگر ولولہ انگیز داستانیں رقم کرنا پڑیں۔ ایثار و قربانی کے کیسے کیسے مناظر قلب و نظر کو ضیاء دیتے ہیں۔ کاش ہم اسلام کی قدر کریں۔ ایمان کو قیمتی جانیں، قرآن و سنت کو اپنائیں اور ان چراغوں سے اپنی رہِ حیات کو بھی منور کریں اور دوسروں کے رستے گل و گلزار کرنے کی بھی سعی کریں تاکہ دنیا و آخرت کی لامتناہی نعمتیں ہمارا مقدر بن جائیں۔

رضاء اللہ حیدر کی شخصیت ہر لحاظ سے اسم با مسمیٰ دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو کئی اساتذہ کرام نے آپ کے بارے میں اپنی آراء قلم بند کی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد زکریا یوں بیان کرتے ہیں:

"رضاء اللہ حیدر ایک بہترین تحقیقی اور تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں۔ رضاء اللہ حیدر کا کلام بہت سادہ اور رواں دواں ہے اور یہی سادگی اور روانی اس کے قاری کے لیے ابلاغ کی آسانی اور تاثیر کی رعنائی کا پیغام لے آتی ہے۔ یہ ارمغانِ محبت فکر و نظر کو کھینچتا ہے اور ہمارے قلوب و اذہان کو اللہ جل مجدہ اور اُس کے حبیب مکرم کی پاکیزہ محبت کی وادیوں میں لے جا کر سرشاری کی کیفیت عطا کرتا ہے۔ ایک طرف قرآنی انوار کی بارش کا سماں ہے تو دوسری سمت سیرت رسول ﷺ کے مہکتے پھولوں کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی نظر آتی ہے۔ میری دعا ہے کہ شاعر ہدایت کے اسی مینارۂ نور کو لے کر چلتا رہے اور ہمارے لیے خیر کا پیغام لاتا رہے۔ ۱۹

اُن کی شخصیت کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق (ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) یوں رقم طراز ہیں:

"رضاء اللہ حیدر کی نعت میں ایک سمت شرعی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی شعوری کاوش نظر آتی ہے تو دوسری طرف رواں اور مترنم بحروں کا انتخاب، منفرد قافیوں اور ردیفوں کا استعمال تغزل اور ادبیت کی تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ اُن کی نعت میں سیرت النبی ﷺ سے متعلق تلمیحاتی عناصر کا بیان معنی خیز ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرِ ذیشاں ﷺ کی تعلیمات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اہل بیتِ اطہار اور صحابہ کرامؓ کے خیال افروز تذکار بھی ہیں اور وادئ حجاز کی مقدس فضاؤں کے انوار و تجلیات کے فیضان کی بات بھی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی تہذیب اور اتحادِ ملت کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ غالباً اُنھی خصوصیات کی بناء پر اُن کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو اہلِ نظر صاحبانِ علم و فن نے خوب سراہا ہے۔ ۲۰

رضاء اللہ حیدر کی شخصیت کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر محمد افتخار شفیع یوں رقمطراز ہیں:

"ہمارے طرح دار شاعر رضاء اللہ حیدر خوش نصیب ہیں کہ اُن کا نام آپ ﷺ کے مدح سراؤں کی فہرست میں شامل ہے۔ اُردو نعت میں سراپا نگاری سے متعلقہ مواد خاصا وسیع ہے۔ رضاء اللہ حیدر نے نعت کے مختلف فکری زاویوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس صنف میں رنگوں کی گل کاری کی ہے۔ انھوں نے اپنی نعت میں مدحتِ سرکار ﷺ فداہ اُمی و ابی کے داخلی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر خارجی موضوعات بھی بیان کیے ہیں۔ خارجی پہلوؤں میں اُن کا سیدھا سادہ بیانیہ اظہار شامل ہے۔ لیکن داخلی پہلوؤں میں وہ جذبات اولیت رکھتے ہیں جو تخلیق کار کے داخل میں حسن کے مشاہدے اور خیال و تصور کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے جلو میں ایک تصور لیے ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ایک شعر عشقِ رسول ﷺ کی پرجمال تاثر سے سرشار ہے۔" (۲۱)

آپ کی شخصیت کے حوالے سے پروفیسر محمد اکرم طاہر اپنے خیالات کو یوں منعکس کرتے ہیں:

"رضاء اللہ حیدر کے ہاں خیالات و افکار کی فراوانی ہے۔ اردو، انگریزی ادب نیز علوم اسلامیہ پر اُن کی گہری نظر ہے۔ یہ دعویٰ کرنا تو مشکل ہو گا کہ اساتذہ فن کی طرح لفظ اور خیال اُن کے ہاں بالعموم شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ یہ کہنا البتہ مبالغہ نہ ہو گا کہ اُن کے ہاں لفظ اور خیال کے مابین چنداں مغائرت نہیں پائی جاتی۔ یہ الگ بات کہ مشکل زمین میں طبع آزمائی کے لیے وہ ایک ذوقِ خاص کے مالک ہیں۔ ۲۲

آپ کی شخصیت کے حوالے سے سخن ور نجمی یوں رقم طراز ہیں:

"رضاء اللہ حیدر کا تخلیقی وفور ادب کی مختلف جہات میں صورت گری کرتا نظر آتا ہے۔ شاعری، تنقید اور تحقیق آپ کے علمی اور تخلیقی سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں، لیکن ذات کے سچے اظہار اور کتھارسس کے لیے فنِ شاعری کو ہی اپنی حقیقی جولان گاہ تصور کرتے ہیں۔ ۲۳

رضاء اللہ حیدر کی شخصیت کے بارے میں کاشف مجید یوں بیان کرتے ہیں:

"رضاء اللہ حیدر ایک عمدہ تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی وسعتِ مطالعہ، ان کی شخصیت کا تہذیبی رچاؤ، دل موہ لینے والا انداز گفتگو، تحقیق و تنقید میں ان کی استدلالیت اور غزل و نظم اور حمد و نعت میں ان کے قلم کی روانی قابلِ دید ہی نہیں قابلِ داد بھی ہے۔ رضا صاحب جیسی جامع شخصیت کو آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکت سے جو عقیدت ہے اس کا اظہارِ بلیغ "مدینہ یاد آتا ہے" جیسے عمدہ نعتیہ مجموعہ میں بخوبی ہو چکا ہے۔ ۲۴

پروفیسر محمد صدیق قمر جو کہ رضاء اللہ حیدر کے دوران تدریس کولیگ بھی رہے، ان کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"رضاءللہ حیدر جیسے نفیس انسان، محب خدا اور سول ﷺ، صاحب سوز و درد کی رفاقت اور دوستی کی سعادت حاصل ہے۔ رضاء اللہ حیدر کے اندازِ بیاں کی بے ساختگی، معصومیت اور "از دل خیز د بر دل ریز د" کی الہامی کیفیت سہل ممتنع کی شعری خصوصیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔" ۲۵

پروفیسر محمد ریاض خاں آپ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"میں رضاء اللہ حیدر کی شخصیت اور ان کے خیالات سے واقف ہوں، وہ دھیمے مزاج کے نرم گو اور صلح جو آدمی ہیں، توازن اور اعتدال ان کے ہر گام اور ہر کام میں نظر آتا ہے۔ ان سے مل کر احساس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ ۲۶

رضاء اللہ حیدر کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت سے بھی نوازا۔ آپ نے 1995ء میں حج کیا۔ رضاء اللہ حیدر کی شخصیت کے بارے میں ان کے ہم عصر ادیبوں کی آراء کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ محب خدا اور محبِ رسول ﷺ ہیں۔ صلح جو، امن پسند اور نہایت وسیع القلب طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ صوم و صلوۃ کے پابند ہیں اور

سخاوت کے معاملے میں ان کا ہاتھ کبھی بھی تنگ نہیں رہا۔ طلبہ کے ساتھ تعاون کرنے والے، اساتذہ کے ساتھ خوشگوار رویہ اور ان کے ہر کام اور گام میں بہتری کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی طبیعت میں عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت کے ساتھ محبت کا والہانہ جذبہ بھی ملتا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں مزاحیہ انداز بھی ملتا ہے۔ ہمیشہ لڑائی جھگڑے سے اجتناب کرنا، صبر و تحمل سے کام لینا، انھوں نے اپنی زندگی کا وتیرہ بنا رکھا ہے۔

"مدینہ یاد آتا ہے" آپ کا پہلا حمد و نعت کا مجموعہ کلام ہے جو پروفیسر رانا احسن سلیم کی ترتیب و تدوین میں 2004ء میں شائع ہوا۔ آپ کی حمد و نعت کا دوسرا مجموعہ "ضیائے حرمین" کے نام سے 2017ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کلام میں پچاس حمدیں اور پچاس نعتیں ہیں۔ اس مجموعہ کلام کو 2018ء میں وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان کی طرف سے قومی سیرت / نعت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ آپ کو 12 ربیع الاول کو بین الاقوامی رحمت للعالمین کانفرنس اسلام آباد میں صدرِ پاکستان کے ہاتھوں ملا۔ 2018ء میں ہی آپ کی غزلوں کا مجموعہ "زخم گلاب ہوئے" چھپ کر سامنے آیا۔ آپ کے غزل کے اس مجموعے کو خاصی پذیرائی ملی اور مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے آپ کو مختلف ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ 2020ء میں حمد، نعت اور سلام کا چوتھا مجموعہ "شاخِ ثناء پر مہکے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ 2024ء میں یکے بعد دیگرے آپ کے دو نعتیہ مجموعے "تکریم" اور "سلسبیل" منظرِ عام آئے۔ اس مجموعۂ کلام کو بھی خاصی پذیرائی ملی۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ "پرچم بلند رکھنا" زیرِ طبع ہے

کالج میں آپ کو سخنور نجمی، کاشف مجید، محمد حامد، محمد ریاض خاں، حسن رضا اقبالی اور جنید ثاقب جیسے علمی و ادبی احباب کی صحبت میسر ہے۔ آپ کالج کی مجلسِ علم و ادب اور ادبی تنظیم "ارتعاش" کے روحِ رواں ہیں۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام علمی، ادبی سرگرمیوں کی محفلیں سجتی رہتی ہیں اور یوں آپ علمی و ادبی سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔ آپ جونیئر ادیبوں اور شاعروں کی حد درجہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور بعض شعراء کی شاعری کی ممکنہ اصلاح بھی کر دیتے ہیں۔ بہت سے جونیئر شعراء جب اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھنے کو کہتے ہیں تو آپ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس وقت آپ بیس سے زائد مطبوعہ کتب پر دیباچے تحریر کر چکے ہیں۔ آپ ایم فل کے طالب علموں کو موضوع کے چناؤ اور مقالے کی تکمیل میں بلامعاوضہ مناسب رہنمائی اور تعاون فرماتے ہیں۔ یوں آپ اپنے دیار میں علم و ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اور اپنے حصے کی شمع جلانے میں پیش پیش ہیں۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

۱ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو، شکیل امجد صادق، ۳۰ اپریل ۲۰۲۱ء

۲ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست، مخزونہ رضاء اللہ حیدر اوکاڑا، ص۲

۳ ایضاً ص٦

۴ ایضاً ص٦

۵ ایضاً ص۷

٦ ایضاً ص۸

۷ ایضاً ص۹

۸ ایضاً ص۹

۹ ایضاً ص۱۱

۱۰ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو ایضاً ص۱۰

۱۱ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست ایضاً ص۱۲

۱۲ رضاء اللہ حیدر، تحریری انٹرویو ایضاً ص۱۳

۱۳ ایضاً ص۱۴

۱۴ ایضاً ص۱٦

۱۵ رضاء اللہ حیدر، اوراقِ زیست، ص۱۴

۱٦ ایضاً ص۱۵

۱۷ ایضاً ص۱۷

۱۸ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ''پسِ سر ورق''، ''ضیائے حرمین'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء(

۱۹ پروفیسر ۱۸اڈاکٹر محمد ضیاء الحق ''پسِ سر ورق''، ''شاخ ثناء پر مہکے پھول'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2020ء(

۲۰ ''اندرونی ورق''، ''شاخِ ثناء پر مہکے پھول'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2020ء(

۲۱ ''اندرونی ورق''، ''ضیائے حرمین'' از رضاء اللہ حیدر (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء(

۲۲ رضاء اللہ حیدر، ''ضیائے حرمین''، (لاہور، القلم پبلشرز، 2017ء)، ص۹

۲۳ ایضاً

۲۴ رضاء اللہ حیدر، ''شاخ ثناء پر مہکے پھول''، (لاہور، القلم پبلشرز، 2020ء)، ص۱۵

۲۵ رضاء اللہ حیدر، ''زخم گلاب ہوئے''، (لاہور، نظمیہ پبلیکیشن، 2018ء)، ص۲۲